

یہ شبراٰتی ہے۔ مولا حلوائی کا بیٹا۔ اپنی اسی گلی میں اس کی دودھ دہی کی دکان ہے۔“

”من میاں اتنی جلدی بھول گئے۔ میں تو تمہارا آڑی تھا۔ یاد نہیں ہے ایک بیریو ہوا کہ طواں یوں والی گلی میں تم نے غلیل چلائی۔ غلیل گرڈسل کے پوٹے پر جا کے لگا۔ گرڈسل لوٹ پوت ہو گئی۔ رگھو حلوائی نے دیکھ لیا۔ روں چوادی کہ مسلموں نے پچھی کی اتنا کردی۔ لو جی میں نے کیا کیا کہ گرڈسل کو مٹھی میں دبا، تمہیں بیچ سے کپڑا اور نہشیروں والی گلی میں سنک گیا۔ حلوائی سگرے ٹاپے رہ گئے۔“

میں حیران ہو کر ستارہا۔ کچھ یاد نہ آیا کہ کب ایسا ہوا تھا۔

”لو جی تمہارے لئے ربڑی لا یا ہوں۔“ شبراٰتی نے کوزہ میری طرف بڑھا دیا۔

”ربڑی؟ کیسی ربڑی ہے؟“

”لو اور سنو۔ من میاں پوچھ رئے ہیں کہ کیسی ربڑی۔ ہماری دکان کی ربڑی کی تو اتنی مشہوری ہے کہ باہر سے بھی لوگ اس کی چاٹ میں یاں پاؤ وے ہیں۔“

”بھی لے لو۔“ چھوٹے میاں نے حقہ پیتے پیتے کہا۔

میں نے ربڑی کا کوزہ سنبھالا۔ دو چار باتیں کیں۔ پھر شبراٰتی نے خود ہی رخصت لے لی۔ ”دکان اکیلی ہے۔ پھر آؤں گا۔“

کاغذ سے ڈھکا کوزہ لے کر میں اندر گیا۔ میمونہ سکول سے فراغت پا کر آچکی تھی بلکہ میز پر کھانا بھی چن چکی تھی۔

”کھانا لگ گیا ہے۔“ یا اطلاع دیتے دیتے نظر کوزے پر گئی۔ ”یہ کیا ہے۔“

”ربڑی، شبراٰتی دے گیا ہے۔“

”ربڑی۔“ میمونہ بتا بھوٹی جیسے اس کے منہ میں پانی بھرا یا ہو۔ ”کھانے کے بعد کھائیں گے۔ بہت مزہ آئے گا۔“

کھانا کھاتے کھاتے میں کہنے لگا۔ ”یربڑے وہ دوستی میں لے کر آیا تھا۔ کہتا تھا کہ تمہارا پرانا آڑی ہوں۔ کب کب کے قصے نا رہا تھا۔ مجھے تو ایک بات بھی یاد نہیں آئی۔“

”اے یاد ہے۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔“ میمونہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

”ہاں مجھے تواب کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔“

وہ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”کوئی بھی بات یاد نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ پھر جیسے میرے لئے اس کا جواز پیش کرنا صورتی تھا۔

”زمانہ بھی تو بہت ہو گیا۔“

”اچھا؟“ جیسے اسے دچکا لگا ہو۔ چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”ہاں زمانہ بہت گزر گیا ہے۔“
پھر کھانے کے آخر تک اس نے کوئی بات نہیں کی۔

”میونڈم نے رہڑی نہیں کھائی۔“ بڑی بھابی نے کہا ”تمہیں تو رہڑی بہت اچھی لگتی ہے۔“
”بڑی بھابی پیٹ بہت بھر گیا۔ پھر کھاؤں گی۔“

مردانے کا صحن گرم موسم کے باوجود کتنا شہنشاہی ہورہا تھا۔ دینا نے آج یہاں اتنا پانی چھڑکا تھا۔ کہ صحن میں دن کی دھوپ میں جتنی تپش جذب ہوئی تھی سب مر گئی تھی۔ جب میں رات کو یہاں آ کر بستر پر دراز ہوا تو عجب فرحت کا احساس ہوا۔ شہنشاہی زمین اس سے اٹھتی ہوئی منی کی سوندھی سوندھی خوبصورتی میاں کے حقد کی نیندا آور گڑ گڑا ہوت۔ تاروں بھرا آسمان، لگ رہا تھا کہ جلدی ہی سو جاؤں گا اور کل رات والی نیند سے بھی زیادہ گہری نیند سووں گا۔ تاروں دیکھتے دیکھتے آنکھیں مند نے گلی تھیں۔ غنوگی کی کیفیت تھی۔ بس اسی غنوگی میں شبرا تی کی بات کا خیال آیا۔ اور وہ پورا منتظر آنکھوں میں پھر گیا۔ طوابیوں کی گلی سے گزرتے گزرتے میں نے گردنلوں کو وہاں کھڑے ٹیپل پر شور کرتے دیکھا اور بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی غلیل پر گیا۔ جیب سے غلہ کال غلیل میں فٹ کر کے جو مارا تو باقی گردنلیں اڑ گئیں۔ ایک گردنل پٹ سے زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اور اس کے ساتھ آس پاس کی دکانوں سے ایک شور اٹھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شبرا تی نے پھرتی دکھائی۔ پھر کتنی ہوئی گردنل کو مٹھی میں دبو جا، میرا ہاتھ پکڑا ”من میاں بھاگو۔“ کتنی دیر تک ایک گلی سے دوسری گلی میں دوسری یادی گلی سے تیسری گلی میں بس گلی گلی پھر کائنے رہے۔ لگتا تھا کہ گلیوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کیسے نکلنے یہ یاد نہیں آیا۔ ایک یاد سے دوسری یاد دوسری یاد سے تیسری یاد میں پھر گلیوں کے جال میں تھا یادیں بھی گھیاں ہوتی ہیں۔ نیندا آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں گلیوں میں بھکتا پھر رہا تھا۔

ناشیت کی میز پر میں پچھلی صبح کی طرح تازہ دم آ کر بیٹھا۔ مگر ناشیت کرتے کرتے جب مجھے رات کا خیال آیا تو دم بھر کے لئے

تعجب ہوا۔ ”عجیب بات ہے۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ میونڈم نے سوال کیا۔

”رات مجھے نیند نہیں آئی۔“

”رات گرم بھی تو بہت تھی۔“

”گرمی؟ نہیں گرمی تو اسی نہیں تھی۔ اچھی خاصی خلکی تھی۔“

”تو پھر یہ سمجھ لجئے کہ اب یہ جگہ آپ کے لئے نئی جگہ ہے۔ نئی جگہ پر نیند مشکل سے آتی ہے۔ ایک دوران میں تو اس طرح گزرنی ہی چاہئیں۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کل یہاں مجھے پہلی رات تھی اور میں ایسے ہی سو گیا۔ اور جب صبح اٹھا تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ زمانے بعد مجھے پوری نیند آئی ہے۔“

”پھر کیا بات ہوئی۔“

”بس ہوا یہ کہ سونے لگا تھا کہ وہیان اچٹ گیا..... پھر؟“

”شبرا تی کی بات کا دھیان آیا۔ گزری بسری با تین یاد آتی چل گئیں۔“

”آپ تو کہتے تھے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد ہی نہیں ہے۔ رات رات میں یہ کیا انقلاب آ گیا۔“

”میرے ساتھ ہی ہوتا ہے، لگتا ہے کہ مجھے پچھلی کوئی بات یاد نہیں ہے۔ مگر کسی کسی وقت یادیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ میں ان میں بہتر چلا جاتا ہوں۔“

”اچھی عادت ہے آپ کی۔“ وہ مسکرائی کتنا اطمینان تھا اس کی مسکراہٹ میں۔

”پتہ ہے جب میں یہاں آیا ہوں تو میرے ساتھ کیا ہوا؟“

”کیا؟“

”میں تو اپنے پرانے حساب سے سیدھا لوکشا گیا تھا۔ وہاں کچھ بچا ہی نہیں۔ بس ایک عمارت کا ملبہ پڑا تھا۔ بس ایک دم سے میرا ذہن بھی چھیل میداں بن گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ لوکشا کو اس کے مکینوں اس کے درختوں پرندوں کے ساتھ تصور میں لاوں۔ مگر میرا تصور مجھے جواب دے گیا۔ بہنگم طور پر وہاں گھومتا پھر تارہا۔ پھر جب دھرم شala کی نئی عمارت کو میں نے دیکھا تو ایک دم سے میں چونگا اور ایک دم سے دھرم شala کی وہ پرانی عمارت جو میں خالی چہار دیواری نظر آتی تھی۔ میری نظروں میں گھوم گئی۔ اور کس تفصیل کے ساتھ مجھے واقعات یاد آئے۔ میمونہ تمہیں یاد ہے ایک دفعتم نے وہاں کھڑے ہوئے اونچے پیپل پر لنگور دیکھا تھا اور پھر ہم لنگور دیکھنے کے شوق میں اس طرف چلے تھے۔ رستے میں ہم نے دیکھا کہ ایک سانپ..... یاد آیا۔“ ”نہیں۔“

”نہیں۔ تمہیں یاد نہیں؟ تججب ہے؟“ مجھے کتنا تججب ہوا۔

ادھر میونہ جیسے یادوں میں کھو گئی ہو۔ لیکن جھر جھری لی۔ ”ہاں یاد ہے۔“ پھر چپ ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”عجب بات ہے۔“
لگور کو میں نے اس کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا۔“

”بس اس یاد نے دلکشا کی ساری یادوں کو میرے اندر زندہ کر دیا۔ کتنا کچھ یاد آ گیا ایک دم سے۔“
”من۔“ میونہ ابھی تک اسی یاد میں اُنکی ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے تعجب سے میونہ کو دیکھا جس نے میری آمد کے بعد پہلی مرتبہ میرے پچھن والانام لے کر مجھے مخاطب کیا تھا اور
کتنی اپنا نیت کے لہجے میں۔

”کتنا لمبا سانپ تھا وہ۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ اگر وہ کہیں ہمیں کاٹ لیتا۔“

”پھر کیا ہوتا ہم مر جاتے۔“ میں نے سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے جیسے سماں نہ ہو ”من۔“ اس کے لہجے میں کتنی حیرت اور کتنا ذرخیز یا ہوا تھا۔

”ہوں۔“

”اس دھرم شالا میں کیا تھا۔ کوئی بھی اس کے اندر آتا جاتا تو نظر آتا نہیں تھا۔ باہر سے بس شپل کے درخت دکھائی دیتے تھے۔“
”یا لگور؟“ میں نے مسکراتے ہوئے نکلا گیا۔

وہ بھی ہنس پڑی ”وہ بھی بس ایک ہی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔“

آج صحیح سے گھٹا میں امنڈ رہی تھیں۔ بڑی بھائی نے آسمان پر ایک اڑتی سی نظر ڈالی اور فیصلہ شادیا ”ٹلاکھڑا ہے۔ ٹوٹ کے
بر سے گا۔“ پھر ناشتہ کرتے کرتے بولیں ”آج تو کڑھائی کا دن ہے۔ پتھیں گھر میں میں ہے بھی یا نہیں۔“
”میں“ میونہ بولی۔ ”میں تو گھر میں کوئی نہیں ہے۔ جو تھا اس کی میں نے پچھلے جمعہ کو کھنڈ دیاں بنائی تھیں۔“ ”پھر منگانا پڑے
گا۔“

میونہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اپنے سکول چل گئی۔ گر تھوڑی ہی دیر میں آ بھی گئی۔

”ارے تم تو واپس آ گئیں“ میں اسے واپس آتے دیکھ کر کتنا خوش ہوا تھا۔

”میں نے سوچا کہ آج چھٹی کرو“

”کس خوشی میں؟“

”برکھا کی خوشی میں سوچا کہ تمہیں اپنے ہاتھ کی پھلکیاں کھلاتی ہوں اور ہاں اردوی کے پتے بھی تور کئے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم“

”شکر یہ“ میں مسکرا دیا۔

اصل میں اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چلے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آپس میں کتنے گھل مل گئے تھے۔ کہ میں نے اپنے سارے دکھ لکھ پاکستان کے ایام کی ساری کہانی اسے سنادی اور اس نے بھی کرید کرید کے ایک ایک بات مجھ سے پوچھی شادی کیسے کی۔ بیوی کیسی تھی کیا اسے بیماری ہوئی کیسے دینا سے گئی۔ یہ مجھ سے کسی نے پوچھا بھی نہیں تھا اور میں نے بتایا بھی نہیں تھا اور اگر کوئی پوچھتا بھی تو میں بس واقعی حد تک ہی بتاتا۔ مگر میونہ نے کتنی اپنا نیت کے ساتھ پوچھا کہ میں نے پوری قلبی کیفیت کے ساتھ ایک ایک تفصیل اسے سنائی ”بس ایک لڑکا ہے؟“

”ہاں“

”اسے تم نے امریکہ بھیج دیا۔ اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا“ ”بات یہ ہے میونہ پاکستان میں بیٹے اپنے باپوں کے ساتھ وہی کر رہے ہیں جو ان کے باپوں نے اپنے باپوں کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے باپوں سے منہ موڑ کر پاکستان کی راہ پکڑی تھی اب ان کے بیٹے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر امریکہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔“

دھیرے دھیرے کر کے میں نے اپنی ساری ہی رام کہانی اسے سناؤالی اور اس نے کتنی دردمندی اور کتنی یکسوئی سے ساری رام کہانی سنی۔ اس کے بعد میں کتنا بالکا ہو گیا تھا۔ دل پر برسوں سے جو ایک بوجھ ساتھ اور جو وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اتر گیا اب تک مجھے کوئی ایسا ملا ہی نہیں تھا۔ کہ دردمندی سے میری رام کہانی سنتا۔ یہاں آیا تو بڑی بجا بھی اور چھوٹے میاں نے بھی سرسری مرحومہ کے متعلق اور بیٹے کے بارے میں پوچھا اور میرے رسمی جواب سے مطمئن ہو گئے پوچھنا اور سننا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو میونہ کے سلوک سے پتہ چلا۔ تو اب میں بالکا تھا۔ اور میونہ کے یہاں بھی اگر میری طرف سے کوئی دل گرفتگی تھی تو وہ غیر محظوظ طور پر دور ہو گئی تھی اب ہم ایک دوسرے سے کتنے قریب آگئے تھے کس انہاک سے وہ اردوی کے پتے بیسن میں لپیٹ لپیٹ کر قتل رہی تھی اور کس شوق سے میں کھارہاتھا کتھے زمانے کے بعد زبان کا ذائقہ واپس آیا تھا۔ خود کھارہاتھا اور بجا بھی کو ساتھ کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

”ارے بھیا کیا پوچھو ہوئہ ہم وہ رہے نہ بر ساتیں وہ رہیں۔“ بڑی بھائی کھا کم رہی تھیں بیتی بر ساتوں کو زیادہ یاد کر رہی تھیں۔

”ساون کے ساتھ کڑھائی چڑھے تھی اور بھادوں تک چڑھی ہی رہوئے تھی۔ میں بھی کبخت چھاجوں بر سے تھا۔ اور پکوان بھی اسی

حساب سے کپکے تھا۔ کھانے والے بھی تو کہتے تھے۔ اور روزنی سے نبی فرمائیں۔ ”بڑی بھابی بولتے بولتے چپ ہو گئیں لمبا خندنا سانس لیا۔ پھر افسردگی لجھے میں گھری ہو گئی ”وہ زمانے ہی گزر گئے اب تو یہ حال ہے کہ مینہ برستا رہتا ہے اور میں خندنے کے چوہلہ کو دیکھتی رہتی ہوں۔ پتہ نہیں آج میمونہ کو کہاں سے کڑھائی کا خیال آ گیا“، رکیں پھر بولیں ”برساتیں بھی بخت ماری ویسی نہیں رہیں۔ کیا جھمکا لگتا تھا کہ پورا پورا ہفتہ گزر جاتا اور سورج کی صورت نظر نہیں آؤتے تھی۔ ارے ایک دفعہ تو ایسی جھمکی لگی کہ پندھروواڑہ بیت گیا۔ اور بخت مارا مینہ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا۔ بھی پھویاں پھویاں، بھی رم جھمک بھی دھڑا کے کے ساتھ۔ پھوپھی اماں نے کیا کہ بی بی کے نام کی تسبیح درخت میں لٹکا دی۔ اے لودن ڈھلتے ڈھلتے دھنک لگلی آئی کہ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پوری کمان۔“

”میمونہ تمہیں یاد ہے“ مجھے بھی ایک برسات یاد آ گئی تھی۔ ”جب ایک دفعہ دوپھر کی چلچلاتی دھوپ میں ہم بھونزہ میں بڑھیاں پکڑتے پھر رہے تھے۔ ایک دم سے گھٹا امنڈ کے آئی اور ایسی برسی کہ بھونزہ دیکھتے تیا بن گئی۔ کن مشکلوں سے بھوپت نے ہمیں دہاں سے نکلا تھا۔“

”اور من تمہیں یاد ہے“ میمونہ کو بھی ایک برسات یاد آ گئی ”جب دلکشا والے باغ میں جو پرانا نیم تھا انہاں پر بجلی گری تھی۔ لگا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ نہم کے پر خپے اڑ گئے۔ بھوپت بتاتا تھا کہ اصل میں اس وقت اس نہم پر ناگ نکلا ہوا تھا۔ بجلی اس پر گری تھی۔“

بس پھر ہمیں بیتی برساتیں یاد آتی چلی گئیں۔ بڑی بھابی نے شاید محسوس کیا کہ یہ ہماری سا جھے کی برساتیں ہیں جن میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو فاتحہ جانا اور آہستہ سے اٹھ کر چلی گئیں۔

ایک برسات، دوسری برسات، تیسرا برسات، ایک دم سے ہمیں کتنی برساتیں اکٹھی یاد آ گئی تھیں؛ جیسے گھری گھٹا امنڈ آئی ہو۔ یادوں کی گھٹا بھی کتنی ظالم گھٹا ہوتی ہے۔ ہم جیسے پھر سے بچے بن گئے ہوں۔ میمونہ اور من ایک دوسرے کی انگلی پکڑے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ اس دن کتنی بارش ہوئی تھی آنگلن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ دونوں برآمدے میں بیٹھے بنتے گزرتے بلبلوں کو گن رہے تھے۔ بوندوں کے بیچ اچانک کوئی بلبلہ ابھرتا اور تیزی سے دوڑتا چلا جاتا۔ ارے ارے وہ دیکھو صاحب کا ٹوپ جا رہا ہے“ وہ خوشی سے چلاتی اور اس دم بلبلہ اچانک سے پھٹ جاتا۔ پھر دوسراؤپ پھر تیسرا اوپ اور پھر دونوں نے اپنی اپنی ناؤ چھوڑی۔ کاغذ کی دوناویں کس تیزی سے بہتی چلی جا رہی تھیں۔ میمونہ نے خوشی سے تالی بجانی شروع کر دی ”آہا میری ناؤ آگے جا رہی ہے۔ من کھسیانا

ہو چلا تھا کہ میمونہ کی ناؤ بھی زد میں آگئی۔ آنکن کے پیچے ایک بڑی سی اینٹ پڑی تھی ناؤ اس سے لکڑا کر رک گئی اور پھر بھیگ کر کھلنے لگی۔ اب تالی بجائے کی من کی باری تھی۔ من کی ناؤ ڈولتی چلی جا رہی تھی۔ میمونہ روہانی ہو گئی تھی۔ من خوش تھا مگر تھوڑا آگے جا کر من کی ناؤ آموں سے بھرے ناند سے جو پیچ آنکن میں رکھا تھا لکڑا اور فوراً انی اس کے جوڑ جوڑ کھل گئے۔ آگے پیچھے دونوں ناؤں کی دو بُکیں مگر من نے تو فوراً ہی توجہ ہٹانے کا اہتمام کر لیا۔ اپنی چکنی نکال گھمانی شروع کر دی کس تیزی سے چکنی اس کی الگیوں کے پیچے نکل کر گھر رکھ رکتی ہوئی اور ڈور کی حد تک پہنچ کر اسی تیزی سے مٹھی میں آ جاتی۔ میمونہ دیکھتی رہی دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جواب میں اپنی لال پیلی پھر کرنی نکالی اور گھمانی شروع کر دی من جو بھی کرتا اس کے جواب میں میمونہ کو بھی کچھ کرنا ہوتا تھا۔ وہ دن جب من بازار سے اچھا سائیسو خرید کر لایا۔ میمونہ پھل گئی میں بھی میسولوں گی۔ پھر پچھی اماں نے ڈانٹا ”باولی ہوئی ہے۔ میسولوں کیوں کے لئے تھوڑا ہو وے ہے۔ لڑکیاں تو جھانجی لے کے نکلیں ہیں۔“

تو میمون کے لئے جھانجی آگئی مٹی کی لٹیا۔ اسکے گرد آنکھ کی شکل کے سوراخ سوراخوں پر بیز پتالیا کاغذ منڈھا ہوا۔ اندر دیوالا لمبا تاہا لو جھانجی میں پیسے پڑنے شروع ہو گئے۔ ”واہ بینا مفت کے پیسے بُور رہی ہو جھانجی کا گیت تو گا کے سناو۔“ جھانجی کا گیت اسے یاد ہوتا تو سناتی۔ من نے تو میسو کا گیت فوراً ہی سنا ڈالا۔

میرا	کھانے	کو	میں	میں	اڑا
دہر	دے	ماں	وہی	بڑے	بڑا
دہی	بڑے	میں	پنی	میں	انھی

”پھوپھی اماں یہ نیسو جھانجی کا کیا بکھیرا تھا۔“ شاید بڑی بھابی نے پوچھا تھا۔ پھوپھی اماں فوراً ہی شروع ہو گئیں۔ ”ارے وہ ناس پیٹا گندھاری کا جنا، پانڈوؤں کی چلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کھیاں جی نے جھانجی بنا کے اس کا بیاہ اس سے کر دیا کہ اس کا دھیان بٹ جاوے۔“

۹۳

”اے بی یہ سب ہندو ای باتیں ہیں۔ اللہ جانے اس میں کتنا حجج ہے کتنا جھوٹ ہے عذاب ٹو اب ہندوؤں کی گردن پ۔ ہم نے توجہ سناؤہ سناؤ پا۔ یہ بھی کہوئے ہیں کہ جماں جنگی اصل میں ٹیکوکی جو رُتھی۔“

”پھوپھی اماں بچ کہو۔“

”اے بی میں کیا جانوں۔ ہندوؤں کی کبی ناؤں ہوں۔ ویسے ایک بات تو ہے اس کھلوئے ٹیسو کوون اپنی بیٹی دیتا۔ کھیا جی نے اتنا احسان تو اس پر کیا کہ ایک گڑیا سی کنیا بنا کے اس کے حوالے کر دی کر لومیاں گذے گڑیا کو سنگھواو۔“
میمونہ نے فوراً اسی الائچا شروع کر دیا۔

گا جر کی پیندی گلخیر دکا پھول

لومیاں گذے تمہیں گڑیا قبول

”بارش تیز ہو گئی۔“

”کیا۔“ میں چونک پڑا۔ میمونہ نے تیز ہوتی بارش کو دیکھ کر ایک اڑتا سافترہ کہا۔ اور ادھر یادوں کی بد لیاں تنزہ تر ہو گئیں۔
بارش واقعی تیز ہو گئی تھی۔ پہلے سیدھی برس رہی تھی۔ پھر تر چھپی برستے گئی۔ اور اب دھواں دھاروا لے مرحلہ سے گزر کر اس کی رفتار میں ایک توازن بھی آ چلا تھا۔ تیزی کم، شور بھی کم۔ مگر تو اتر کچھ اس قسم کا تھا کہ جیسے ایک زمانے سے یہ میند برس رہا ہے اور ایک زمانے تک برستا رہے گا۔ کتنی دیر تک کس اشہاک سے ہم دونوں اس تر چھپے میند کو تکتے رہے کتنی دیر تک یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میند کا رخ بدل کر ہماری طرف ہو گیا ہے۔

بس وہ ایک دم سے چونکی ”بوچھار آ رہی ہے۔“ اپنا مونڈھا چھپے سر کاتے ہوئے مجھے ہدایت کی ”من تم بھیگ رہے ہو۔ مونڈھا اندر سر کالو۔“

”نہیں۔“

”نہیں؟“ میمونہ نے مجھے تعجب سے دیکھا ”بوچھار تیز ہے۔ سارے کپڑے تر تر ہو جائیں گے۔“
”بیکھ ہو جائیں۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر وضاحت کی میمونہ تمہیں یاد نہیں ہے۔ مجھے بارش میں بھیگنے کا نہانے کا کتنا شوق تھا۔“

”تو تمہارا پچھنا ابھی گیا نہیں ہے؟“

اس فقرے نے مجھے افسرده کر دیا۔ ”کاش اس بچپنے کو میں بچا کر رکھ سکتا۔“ یہ کہتے کہتے میری نظریں سامنے بھن میں کھڑے بارش میں بھیگتے نیم پر گئیں اور جبکی کی جبکی رہ گئیں۔ جیسے یہاں کے آنے کے بعد پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہوں۔ کتنے سکون سے کھڑا

بھیگ رہا تھا۔ جیسے بھی سکون اس سے بچوٹ کر پوری فضائیں سراست کر گیا ہوئی تھی ہوئی بارش میں بھی ورنہ جب وہ شروع ہوئی تھی تو اس میں ایک اضطراب کی کیفیت تھی اور اسی حساب سے پوری فضائیں ایک کھلیلی مجھ تھی۔ مگر اب بارش میں بھراؤ آ گیا تھا۔ ایک ہی رفتار کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی تھی۔ پیروز پودے دیواریں منڈیریں سب بوندوں میں شر اور جیسے تھنگی مت چکی ہوا راب سب آسودہ ہوں۔ اور نیم پر تو ایک پر دگی کا عالم تھا۔ بالکل وہی عالم۔ زمانے پہلے کا نقشہ ایک دم سے آنکھوں میں پھر گیا۔ جب آندھی اٹھتی تھی تو پورا نیم ہل جاتا تھا۔ ٹھنڈیوں کے پیچ کھلیلی مجھ جاتی تھی۔ گرج، چمک، پھر دھڑکے سے مینہ بر سنا شروع ہو جاتا۔ آندھی تھمتی چلی جاتی۔ لگاتار برسی بوندوں میں شر اور ہو کر کر ٹھنڈیاں بھی شانت ہوتی چلی جاتیں۔ اور پھر نیم پر ایک پر دگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ نیم پر، پھر پوری فضا پر۔

”میمونہ، نیم کو دیکھ رہی ہو۔“

”ہاں دیکھ تو رہتی ہوں۔ پھر؟“

”میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا ہی نہیں تھا..... ویسا کا ویسا ہی ہے۔“ اور یہ کہتے کہتے میں حیرانی میں ڈوب گیا۔ اس زمانے میں بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ یہاں دونوں تو بزرگ تھے۔ دادا میاں اور نیم۔ جیسے دونوں ہم عمر ہوں۔ مگر دادا میاں کی کمر جھکتی چلی گئی۔ بال پہلے ہی برف ہو چکے تھے۔ پھر ایک دن آنکھیں مند گئیں۔ اس روز یہ نیم کتنا معموم نظر آ رہا تھا۔ اکیلا رہ گیا تھا۔ مگر پھر اسی طرح شاداں اور فرحاں۔ ہم دونوں تو بس اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے تھے؛ جیسے اسی کا حصہ ہوں۔ جیسے میمونہ اس کے تنے سے نکلی ہو؛ دھیرے دھیرے اور میں جیسے اس کی ٹھنڈیوں میں سے ایک ٹھنڈی۔ گے، میں نے سوچا، باقی ٹھنڈیاں تو ابھی تک ہری بھری ہیں۔ بالکل پہلے کی طرح۔ اداں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر مجھے حیرانی نے آ لیا۔ بالکل ویسا کا ویسا ہی ہے۔ کمال ہے۔ ہم بدل جاتے ہیں، درخت نہیں بدلتے۔ ہمارا نیم ویسا کا ویسا ہی ہے۔ ہاں اب..... اور اس کے ساتھ کتنے نقشے کب کب کے میرے تصور میں گھوم گئے۔ جب اس کے موٹے گدے میں جھولتا پڑتا تھا۔ میمونہ کتنا مبارجہ ٹھنڈی تھی کہ اس کا سر بکھرتے بالوں کے ساتھ اونچی ٹھنڈیوں کو جا چھوتا۔ مگر میمونہ بس جھولا ہی جھول سکتی تھی، لمبے جھونٹنے لے سکتی تھی۔ نیم پر چڑھنہیں سکتی تھی۔ خیر زیادہ اونچا تو میں بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ مگر اس کے نیچے والے گدے تک تو پہنچ ہی سکتا تھا۔ کتنا مزہ آتا تھا اس گدے پر بیٹھنے میں جیسے ہم زمین سے بلند ہو گئے اور نیم کا حصہ بن گئے ہیں۔ ٹھنڈیوں میں سے ایک ٹھنڈی۔ اس وقت میمونہ کتنی تملکاتی تھی۔ مگر میری اس میں کیا خطأ تھی۔ میں اسے روکتا تھوڑا ہی تھا۔ بلکہ میں تو اسے سہارا دے کر چڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا۔ عجب سی لذت کا احساس ہوتا تھا۔ محض چھولینے سے اور

اس کوشش میں تو..... کتنے ایسے موقعے یا کیک دھیان میں ابھر آئے۔ اور کسی کسی دفعہ تو وہ میرے سہارا دیتے دیتے ایسا پھلٹتی تھی کہ دھیان میں لاتے لاتے میں خود ہی جھینپ گیا۔ پتہ نہیں میں نے سوچا، میمونہ کو بھی یہ سب کچھ یاد ہے یا نہیں۔ یاد ہونا تو چاہئے۔

”میمونہ۔“ آخر میں نے ہمت کی ”یہ نیم بالکل بھی تو نہیں بدلا..... میرا مطلب ہے کہ جب ہم.....“ میں کچھ کہتے کہتے بھج گیا۔ پتہ نہیں میمونہ کو کچھ یاد آیا بھی یا نہیں۔ ہوں کر کے چپ ہو گئی۔

پھر مجھے ایک اور خیال آیا ”میمونہ تمہیں بھی تو ایک شوق تھا۔“

”کونا شوق۔“

”جھولا جھولنے اور ساونی گانے کا شوق۔“

”ہاں۔“ میمونہ اب کے واقعی افسرده ہو گئی۔ لیکن بس ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔

”کڑھائی تو چڑھی، جھولا نہیں پڑا برسات آدھی منائی گئی۔“

”یہ لڑکیوں کا شوق ہوتا ہے۔ تمہیں اس گھر میں کوئی لڑکی نظر آتی ہے۔“

”تمارے شوق کو کیا ہوا؟“

”تم میری عمر کو دیکھ رہے ہو؟“

”دیکھ رہا ہوں، کیا ہوا تمہاری عمر کو؟“

وہ پٹپٹا کر چپ ہو گئی۔ پھر انھوں کھڑی ہوئی اور اندر چلی گئی۔ ہینہ اسی ایک رفتار سے بر سے جا رہا تھا اسی اپنے ترجمے انداز میں۔ میں واقعی تربت ہو چکا تھا۔ مگر مجھے اچھا لگ رہا تھا سامنے صحن میں ندی امنڈی ہوئی تھی۔ بوندیں ایسے گردہ تھیں جیسے الجٹے تمل میں پھلکیاں۔ کوئی کوئی بوند اس طرح پڑتی کہ پھول کر ٹوپ کی شکل بن جاتی۔ ٹوپ تیرتا چلا جاتا، پھر پھٹ جاتا۔ ایک ٹوپ دوسرا ٹوپ تیرا ٹوپ، بننے گزتے پانی کے ٹوپ۔ بارش ہوئے چلے جا رہی تھی۔ اندر جب ہوئی گرد سب دھل دھلا گئی تھی۔ دھل دھلا کر ایک نیا آپ اندر سے نکل آیا تھا۔ یا شاید پرانا آپ انھر کرا بھر آیا تھا۔ بس میں اپنے آپ کو اجلا اجلامحسوس کر رہا تھا جیسے اندر سے دھل گیا ہوں۔

وہ واپس آئی ”من، تم بالکل بھیگ چکے ہو۔ با تھر روم میں میں نے پائچا مہم کمر بند ڈال کر اور کرتا ٹانگ دیا ہے۔ جا کر نہاوا اور

لباس بدلو۔"

میں بردباری سے اٹھا اور با تھر روم کی طرف ہو لیا۔ نہاد ہو کر اجلا کرتا پانچا مسہ پہن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ بارش رک چکی ہے اور میمونہ مونڈھے پتیخی پت نالے سے گرتے موٹی جیسے پانی کو یکسوئی سے نکلے جا رہی ہے۔ میں مونڈھا کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ پت نالے سے پانی پہلے بہت تیز گرا تھا۔ رفتہ رفتہ تیزی قدر کے کم ہوئی اور دھار بھی موٹی سے ٹلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور یہ دھار جب کرنے میں گرتی تھی تو گلتا تھا کہ پچھلی ہوئی چاندی بکھر رہی ہے۔

سامنے والی منڈیر پر اچانک ایک گزر مسل اتری۔ ایک پھریری لی، پروں کو پھر پھڑایا اور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دوسرا گزر مسل اڑ کر آئی اور اترتے ہی اس نے بھی زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ دونوں نے مل کر تھوڑی دیر شور مچایا اور ایک ایک پھر سے اڑ گئیں۔

"میمونہ تم نے سنا نہیں نے آپس میں کیا کہا اور کیوں اڑ گئیں۔"

"تم نے سنا ہو گا۔ تمہیں معلوم ہو گا۔"

"پہلے جو گزر مسل آئی تھی وہ اصل میں نہ تھا۔ اس نے پکار کر کہا کہ جامن بارش رک گئی ہے۔ باہر نکلو۔ ذرا سیر کو چلتے ہیں۔ دوسرا یہ آوازن کر پر دے سے برآمد ہوئی۔ خوش ہو کر بولی کہ ارے واہ واہ بہت اچھا موسم ہے۔ سیر میں بہت مزہ آئے گا اور دونوں سیر پر نکل گئے۔"

میمونہ ٹھکٹھلا کر رہی۔

مگر اب میری نظریں منڈیر سے پھسل کر پوری دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کافی لگلی دیوار دھل کر کتنی چمک انھی تھی۔

"میمونہ یہ سامنے والی دیوار کو دیکھ رہی ہو، کتنی کالی ہو گئی ہے۔ اور پیچ پیچ میں سبز کا ہی جھلک رہی ہے۔"

"ہاں واقعی۔" اور وہ ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ چہلی مرتبہ اس دیوار کو دیکھ رہی ہے۔

"اس سے پہنچتا ہے کہ اس حوالی نے کتنی برساتیں دیکھی ہیں۔ برساتیں ہم سے پہلے بھی آئی ہوں گی جو ہمارے بڑوں نے دیکھی ہوں گی۔ مگر ہم نے بھی ان برسوں میں جب میں ابھی یہیں تھا کتنی برساتیں دیکھ لیں۔ لگتا ہے کہ پورا زمانہ ہم نے جیا ہے۔ برساتوں کی ایک پوری صدی..... ہاں پوری صدی..... اگلی برساتیں آنے والے دیکھیں گے۔"

"آنے والے؟" میمونہ نے مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ الجھ میں ایک ہلکی تلخی آگئی "کون آنے والے دیکھیں گے۔ سب تو چلے

گئے۔“

میں چپ ہی تو ہو گیا، جیسے مجرم جرم کا احساس دلانے والے جانے پر چپ ہو جائے۔ کتنی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ مونڈ سے آنکھیں ملانے کی اور بات کرنے کی اب مجھ میں ہمت کہاں رہی تھی۔ بلکل ہلکی بوندیں پھر پڑنے لگی تھیں۔ پھر بلکل سے تیز ہوتی گئیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اپنی پرانی حوصلی اپنی آخری برسات دیکھ رہی ہے۔

بڑی بھابی کا سروطہ اور زبان دونوں ہی اس دن کچھ زیادہ روایت تھے۔ کب کب کے قصے کہاں کہاں کی باتیں جیسے حافظہ کے سارے دریچے کھل گئے ہوں۔ ویسے ان چند دنوں میں وہ اتنا کچھ سننا کچھ تھیں کہ میرے جانے کے بعد سے اب تک خاندان جن کے مراحل سے گزرتا تھا وہ سب اپنی تفصیلات کے ساتھ میری معلومات کا حصہ بن چکے تھے۔ خیر اپنے جانے کے بعد کے حالات سے تو میں بے خبر تھا ہی مگر اب پتہ چلا کہ اس سے پہلے کی خاندان کی تاریخ سے بھی میں اتنا باخبر نہیں تھا جتنا اپنے آپ کو بھرتا تھا۔ بس میں خبر اور بے خبری کے دورا ہے پر تھا کہ یہاں سے سے چلا گیا۔ خاندان کی تاریخ کبھی اپنے کسی فرد پر اکٹھی مکشف نہیں ہوتی۔ بے شوری سے شوری کی منزل کی طرف اور شوری کی منزل سے ذہنی پیشگوئی کی طرف سفر کرتے ہوئے بڑے بوڑھوں کی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں اور غیر محسوس طور پر اور بے ارادہ خاندان کی تاریخ شوری میں پوسٹ ہوتی چلی جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ کتنی باتیں تھیں جن کا مجھے کوئی پتہ نہیں تھا۔ مثلاً جب سے میں نے ہوش سنجا لاؤ پھوپھی اماں گھر میں برا جہاں دیکھا۔ کیا ان کا رعب داب تھا۔ تائی اماں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ آخر دو صاحب حیثیت بھائیوں کی بہن تھیں۔ ایک کو چھوٹی بہن کی حیثیت سے عزیز تھیں۔ دوسرے پر بڑی بہن کی حیثیت سے رعب رکھتی تھیں۔ دلکشا کے چھوٹے بڑے ان کا لوہا مانتے تھے۔ باور پی خانے میں انہیں کا حکم چلتا تھا۔ مگر نہ میں نے کبھی سوچا نہ یہے پتہ چلا کہ جب پھوپھاز نہ و سلامت ہیں اور اپنے قصبہ میں ایک حیثیت کے مالک ہیں تو پھر پھوپھی اماں دلکشا میں کیوں برا جی ہوئی ہیں۔ لڑائی بھی نہیں تھی۔ لڑائی ہوتی تو برسات کے برسات ان کی طرف سے آم کی پیٹیاں کیوں آتیں اور جاڑوں میں گنوں کی پھاندیاں اور گنے کے گھرے کیوں آیا کرتے۔ ہاں خود کبھی نہیں آئے تھے۔ میں نے انہیں بس ایک دفعہ دیکھا تھا جب وہ پیارے میاں کی شادی کے موقع پر اس نائی کو لے کر آئے تھے جو ان کی دانست میں قورمے اور بریانی کے پکانے میں اتنی مہارت رکھتا تھا کہ ولی کے باور چیزوں سے نکلے سکتا تھا۔ مگر شادی کے پورے عرصے میں وہ جب نظر آئے باور پی خانے ہی میں نظر آئے۔ مونڈ ہے پہ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پکانے والوں سے دنیا جہاں کی باتیں کر رہے ہیں۔ اندر سے جب نائن

کسی کام سے یہاں آتی تو اس سے تھوڑی چہل کرتے۔ اس کے چلے جانے کے بعد پھر باور چیزوں سے مخاطب ”ہاں کیا ذکر ہو رہا تھا میاں بلا قی۔“

” قادر۔ اچھا پٹھا لکھا تھا۔ جانی پہلوان سے اس کی کشتمی یاد ہے نا۔“

” ہاں جی، خوب یاد ہے۔“

” ہندو کس زور شور سے اسے میرنگھ سے لے کے آئے تھے۔ ویسے وہ پہلوان تھا زور دار۔ جب اکھاڑے میں اتر کے چکر لگا گتا اور مٹی ملتا کہ مست ہاتھی آگیا ہے۔ قادر اس کے سامنے پہنگا لگ رہا تھا۔ مگر خالم نے کیا دھوپی پڑا مارا ہے کہ بھیم خشم جانی چت پڑا تھا۔“

” پر آغا میاں، تمہارے قادر کو اس ڈھنڈو بالو نے چاٹ لیا۔“

” کیا بتا میں میاں بلا قی۔ ہم نے قادر کو بہت سمجھایا تھا کہ کبخت عورت کے قریب مت جائیو۔ مارا جائے گا۔ مگر اس کی گدی میں بات آئی نہیں۔“

” آغا میاں، ایک بیر میرے جی میں آئی تھی کہ بالو کی چوٹیاں پکڑ کے ایک جھانپڑا لگاؤں کو ڈھنڈو چھٹا لای کرنا ہے تو کوئی اور گھر دیکھے۔ ہمارے پہلوان کو بخش دے۔ پر جی کچھ سوچ کے میں چپ ہو گیا۔“ تھنڈا سانس بھرا اور پھر جاری ” ہمارے اکھاڑے کی بہار قادر تک تھی۔ اب خاک اڑے ہے۔ اب سالا جو لمدا آوے ہے وہ چار دن زور کرے ہے اور اپنے آپ کو گاماں سمجھنے لگے ہے۔ پھر ہیرو بننے کے خناس میں بمبی بھاگ جاوے ہے۔“

” ٹھیک کہتے ہو میاں بلا قی۔ وہ نمک حرام شدن۔ میں نے گھنی کے کفتہ اس کے اندر انڈا لیدیے۔ کیا جوان لکھا تھا۔ کیا اس کی چوڑی چھاتی تھی۔ مگر ہوا کیا کہیں کبخت نے بمبی کی بلی والی فلم دیکھ لی۔ بس سلوچنا پر مر منا۔ کہنے لگا بمبی جاؤں گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ ذات کی وہ یہودن ہے تجھے گھول کے پی جائے گی۔ نہیں مانا۔ میں نے کہا، جا، مر۔ چلا گیا۔ پھر کیا ہوا۔ سلوچنا کی تو ڈیور ہی تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ بمبی کے بازاروں میں آوارہ پھر تارہ۔ جب واپس آیا تو میاں بلا قی سچ جانن بالکل چوہا بن چکا تھا۔“

” حق کا لمبا گھونٹ اور پھر جاری۔“ میاں بلا قی، عورت بڑی بلا ہوتی ہے۔ جو اس کے چکر میں پڑ گیا بھجو کہ کام سیگیا۔“

یہ تھے پھوپھا آغا کہ بھی شادی بیاہ کی تقریب سے یا کسی مر نے جینے کے موقعہ پر وارد ہوئے۔ مگر اس طرح کہ خانہ ماوں اور باور چیزوں کے سچ بیٹھ کر اپنی حکمت کے موتنی بکھیرتے اور رخصت ہو جاتے۔ پھوپھا جانی ان کے الٹ تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی، بر میں

حیدر آبادی تراش کی شیر و اینی، علی گڑھ کٹ پانچاہمہ بیرون میں بووالا گرگابی پپ، کیا وقار تھا۔ جس بچ پھوپھا نظر آتے تھے۔ حیدر آباد میں ملازمت کرتے تھے۔ آتے تھے تو بڑے وقار کے ساتھ بیٹھک میں معززین کے بیچ کر گفتگو کرتے۔ آصف جاہی دربار سے منسلک امرا کے قصے قصے ان کا موضوع ہوتے۔ مقامی معززین کتنے مرعوب ہوتے۔ اور کتنی حرمت سے وہ واقعات سنتے۔ ہاں چھوٹی پھوپھو بیچاری دبی دبی رہتیں۔ پھوپھی اماں کی شخصیت کے نیچے وہ اتنی دب گئی تھیں کہ ان کی موجودگی میں بات کرنے کی مجال ان میں کم کم پیدا ہوتی تھی۔ ایک چھوٹی پھوپھو پکا موقوف تھا دسرے بھی ان کے سامنے بات کرنے کی کتنی مجال رکھتے تھے۔ خود پھوپھا آغا بھی ان کے سامنے آ کر بیٹی بن جاتے تھے۔ باور بھی خانے میں بیٹھ کر خانہ ماڈل کے سامنے کتا رعب گناہتھے تھے۔ زنان خانے میں آتے جاتے تو اپنا سارا رعب دا ب پیچھے چھوڑ آتے۔ ویسے وہ زنان خانے میں آتے کہاں تھے۔ آتے بھی تو لئے دیئے سے رہتے۔ اور پھوپھی اماں سے بات کرتے تو میں نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ لگتا تھا کہ دونوں کے بیچ میلوں کا فاصلہ ہے۔

یہ تواب بڑی بھائی کی باتوں سے پتہ چلا کہ قصہ اصل میں کیا تھا۔ مشتری بائی فادو کی جڑ تھی۔ پھوپھا آغا کی راتیں تو مشتری بائی کے مجرے میں گزرتی تھیں۔ پھوپھی اماں کب تک برداشت کرتیں۔ ایک دن تاؤ کھایا اور میکے چلی آئیں۔ پھر کبھی واپس نہیں گئیں۔ بھائیوں کے بھرے پرے گھر سے جو انہیں شفقت تھا اس نے انہیں کبھی تھائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ادھر پھوپھا آغا کا رو یہ یہ تھا کہ تم روٹھے ہم چھوٹے۔ تجدو کے طرف یہ ڈھارس دلانے کے لئے کافی تھی کہ ان کی شادی بے شر نہیں رہی۔

میرے پاپا جانی پر بھی شاید پھوپھی اماں کا پر چھاؤں پڑ گیا تھا کہ ازدواجی زندگی سے انہیں بھی نفور رہا۔ جب تک جنے پر دیں میں رہے۔ برس میں ایک پھیرا لگاتے تھے اور کتنا کچھ ساتھ لاتے تھے کہ گھر بھر جاتا تھا۔ اپنے پرایوں سے مل جلے اور واپس۔ اللہ نے ایک اولاد زینہ دی تھی اس پر قانع تھے۔ ایک دفعہ آئے تو بھائی کو پیاری پیاری باتیں کرتے دیکھا، سمجھ گئے اور بیٹے کے لئے مانگ لیا۔ شاید اب کے اسی لئے آئے تھے۔ اس کے بعد خود نہیں آئے جنازہ آیا۔ اندر باہر پٹس پڑ گئی۔ کون تھا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔ مگر جس پر یہ موت بھاری پڑی وہ میری ای جان تھیں۔ جداً میں پہلے ہی گھلتی رہتی تھیں۔ اب دیکھتے دیکھتے سوکھ کر کاشا ہو گئیں اور سال کے اندر اندر سدھا رہ گئیں۔ مگر اس ڈھانی گھری کی موت کا راز اب آ کر کھلا۔ ”چچا جانی جب آخری دفعہ آئے ہیں تو کتنے خوش تھے۔ جب پھوپھی اماں نے میمونہ کے لئے حامی بھر لی تو نہال ہو گئے سمجھ رہے تھے کہ بہن نے دونوں جہان کی دولت انہیں بخش دی۔ مگر وہ دکھیرا انی خود بھی اجز گئی۔ انہیں بھی لے بیٹھی۔ کسی کمخت نے راجہ کے کان بھرد دیئے۔ راجہ کچے کانوں کا تھا۔ کہاں تو چچا جانی پر اتنا اعتبار کرتا تھا کہ ساری ریاست کا کار و بار ان پر چھوڑ رکھا تھا کہاں یہ بے اعتباری۔ بس چچا جانی نے ہیرے کی

کنی چاٹ کر اپنے آپ کو ختم کر لیا۔“

ماضی کے کتنے اندر ہیروں اجاں والوں میں گھما پھرا کر بڑی بھابی اصل موضوع پر آئیں۔ ”بھیا اگر تم ہماری مانو تو ایک بات کہیں۔“

”جی؟“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ بڑی بھابی کیا کہنا چاہتی ہیں۔

”بھیا ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ جو کہیں گے تمہارے بھلے کی کہیں گے۔ باہر کر کے تم نے دیکھ لیا۔ میں پوچھتی ہوں تم نے کتنا سکھ پایا۔ پھر وہی اسکیلے کے اسکیلے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم میمونہ سے شادی کرو۔“

”میں پڑنا گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔“ ”اب؟“

”اے بھیا میں نے ایسی کوئی فلط بات کہدی۔ تمہارے بھلے کی ہی کہی ہے۔ اور پچا جان نے جو سوچا تھا وہ بھی تمہارے بھلے ہی کے لئے سوچا تھا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیر کرئے جب پھوپھی اماں نے ہاں کر دی تو خوشی سے پھولے نہیں ساتے تھے۔ اور انصاف کی بات ہے پھوپھی اماں بھی تمہیں دیکھ کے جیتی تھیں۔ جب تم چلے گئے ہو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا انہیں تو بالکل چپ لگ گئی۔ یغم انہیں لے بیٹھا۔ میمونہ بیچاری پنجی اکیلی رہ گئی۔ اور میاں جان کے بعد تو بالکل ہی اکیلی ہو گئی۔ اب کون ہے۔ اس دینا میں اس کا۔ بیچاری پنجی۔“ چپ ہوئیں اور پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں کہ خاموشی سے آ کر بیٹھے گئے تھے اور حقد پے جا رہے تھے۔ ”ارے تم بھی تو کچھ بولو۔ تمہاری بھی تو آخوند کچھ رائے ہو گی۔“

”ہماری بہن بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے۔“ چھوٹے میاں نے محشر آکھا۔

”ارے نیک نہ ہوتی تو اس طرح اپنی عمر گزار دیتی۔ اور شتوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ کئی رشتے آئے ایک سے ایک اچھا مگر غریب کا ایسا دل نوٹ گیا کہ پھر اس نے کسی رشتے پہ ہاں نہیں کی۔“

”بہت شریف ہے۔ ہمارے جو بیٹی کی کمی تھی اس نے پورا کر دیا۔ اب وہ ہماری بہن بھی ہے اور بیٹی بھی۔ دو کیاں پوری کی ہیں۔“

”پھر کیا خیال ہے تمہارا۔“ بڑی بھابی نے سیدھا سوال کیا۔ میں چپ رہا۔ جھوکا پھر آہستہ سے بولا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”اے بھیا جانے بھی دو اسی کوئی دیر ہو گئی ہے۔ ابھی کل کی توبات ہے کہ تم یاں سے ہٹتے کھیلتے گئے تھے۔ پتہ نہیں والا جا کے تم پکیا آفت پڑی کہ بال کچھزی کر لئے۔ اور ہم نے تو لوگوں کو بڑھاپے میں بیاہ رچاتے دیکھا ہے۔“ پھر چھوٹے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ ”اجی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس عمر میں شادیاں ہوتی نہیں ہیں۔ اور میمونہ تو اب بھی ماشاء اللہ ویسی ہی ہے جیسی تھی۔ بس

ذرا غمتوں سے جھک گئی ہے۔“

چھوٹے میاں نے حق کا لباکش لیا پھر بولے ”شیک ہے۔ جو اداپنے حالات کو دیکھ لیں، سوچ سمجھ لیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ابھی جواب دیں۔“

”ہاں ہاں بھیا سوچ لو۔ کل کلاں کو یہ مت کہنا کہ چھوٹے میاں اور بڑی بھائی نے پھنسوا دیا۔“

دل ہی دل میں چھوٹے میاں کا میں لتنا شکر گز ار ہوا۔ بڑی بھائی تو گلے پر چھری رکھ کے ہاں کرانے پتلی تھیں۔

وہ رات کس خرابی سے گزری۔ کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ۔ جیسے میرے دو حصے ہو گئے ہوں۔ ایک کہ کہتا تھا، ہاں۔ کس کی مانوں، کس کی نہ مانوں۔ کتنے زمانے پہلے کی خواہش جو کہیں دب دبا گئی تھی ایک دم سے ابھر آئی تھی۔ میرے اندر اس کا غالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر اندر ہی سے مخالفت کی آواز بھی اٹھ رہی تھی۔ فیصلہ کن کردار یادوں نے ادا کیا۔ کہ جو بھی یاد آتی ابھر آنے والی خواہش کو تقویت پہنچاتی اور مخالف میں اٹھنے والی آواز کا زور کم ہوتا محسوس ہوتا۔

صحیح ہوتے ہوتے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مجھے چین آ گیا ہو۔ شاید میری اطلاع کے بغیر اندر کوئی فیصلہ ہو گیا تھا۔ مگر مجھے اس فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے یا شاید اس کا اعلان کرتے ہوئے ایک پہنچا ہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا کہ آج کی بات کل پر ٹل جائے تو اچھا ہو۔ مگر کسی طرح۔ بڑی بھائی نے ایک رات کی مہلت تو دے دی تھی۔ مزید مہلات ملتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے آخر خیرل بھائی سے بھی تو ملتا ہے۔ بس میں نے ناشتے کی میز پر پہنچنے سے پہلے ہی اعلان کرڈا۔ ”میں اس وقت میرٹھ جا رہا ہوں۔“

”اچھا؟“ بڑی بھائی بولیں۔

”خیرل بھائی سے ملتا ہے۔“

”خیرل بھائی۔“ چھوٹے میاں تھوڑا چکرائے ”وہ سنگی؟ اس سے ملو گے؟“

”خیرل بھائی کو آپ سنگی کہتے ہیں۔ ہماری پوری پارٹی انہیں جیسیں مانتی تھی۔“

”جیسیں،“ چھوٹے میاں نے حقارت بھرے لہجے سے کہا۔ ”جیسیں ایسے ہوتے ہیں، نگھاد آدمی، زندگی میں کچھ بھی تو کر کے نہیں دیا۔ بہر حال جیسیں روکتا کون ہے ضرور ملو جا کر۔“

میں حیران کہ یا اللہ یا اپنی خیرل بھائی ہیں۔ یہ تو وہ ہیں ہی نہیں۔ وہ چکتے میکتے اپنی زرالی دھنگ والے خیرل بھائی کہاں چلے گئے۔

شايد چھوٹے میاں نے انہیں صحیح سنگی کا خطاب دیا تھا مگر وہ کب سے ایسے ہوئے۔ ویسے اس زمانے میں بھی سنک تو ان پر سوار ہو جایا

کرتی تھی۔ ہمارے جاتے جاتے ان پر کیا سک سوار ہوئی تھی کہ بندھا بستر ہی کھول دیا۔ ہماری پارٹی نے تو انہیں کی کمک پر پاکستان کے لئے بستر باندھا تھا۔ خیال تھا کہ وہ تحریک میں بہت پیش پیش رہے ہیں۔ سب قائدین تک ان کی رسائی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے راوی ہمارے لئے چین رکھتا ہے۔ اور واقعی وہ ساتھ ہوتے تو میں جھگلی شیں کیوں بتتا۔ مگر مت وقت پر انہوں نے ہمیں نوٹس دیا۔

”یا، تم لوگ جاؤ۔ میں نہیں جاتا۔“

”ہم بہت سپشاٹے“ آخر کیوں؟“

”بس میں نہیں رہوں گا۔“

”مگر..... ہم.....“

”تم لوگ جاؤ۔ کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ آخر کسی کو یہاں بھی تو رہنا چاہئے۔“

بس جو دماغ میں تماگنی جمال ہے کہ اس سے اوہرا اوہر ہو جائیں۔ اور اب زمانے بعد میں آیا تھا تو حیران و ششدہ کہ خیرل بھائی کا بدلت کر کیا سے کیا بن گئے ہیں۔ مگر اردو بھی تو بالکل بدلت گیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی محلہ کی اس گلی کو چھوڑ کر جہاں خیرل بھائی کو گھر تھا۔ چیک مہک تو اس گلی کی بھی چلی گئی تھی اور اس گھر کی بھی جو پہلے بہت بھرا پر انظر آتا تھا اور اب اتنا ویران کہ خیرل بھائی کو چھوڑ کر بس ایک بلی نظر آ رہی تھی۔ گلی بھی ویران ہی تھی۔ مگر نقشہ وہی تھا ذرا جو تبدیلی آئی ہے۔ مطلب یہ کہ نقشہ وہی مگر اس طرح آباد نہیں۔ گلی سے باہر مجھے سارے شہر کا نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سارے وہ نشانات جن سے میں اس شہر کو پہچانا تھا جیسے مٹ گئے ہوں۔ ان کی جگہ نئے نشانات نے لے لی تھی۔ عمارتیں، محلہ جیسے سب بدلتے ہوں۔ اور بھیڑ الہی توب۔ کتنی مرتبہ چلتے چلتے احساس ہوا کہ یہ وہ شہر نہیں ہے۔ میں بھول کر کسی اور شہر میں نکل آیا ہوں۔ شاید سب شہروں کے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ اس طرح سے بدلتے ہیں کہ کوئی سخت جان نشان ہی باقی رہ جاتا ہے؛ باقی سب کچھ بدلتا ہے۔ اچھا ہوا کہ ہمارا یا اس پور کوئی بڑا شہر نہ ہوا کہ پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ وہ تو یہ کہنے کے دلکشا کے لمبے نے میری آنکھیں کھول دیں ورنہ مجھے تو سب کچھ ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔

”خیرل بھائی، آپ کا میر ٹھوٹہ بہت بدلتا گیا ہے۔“ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ خیرل بھائی آپ بدلتے ہیں۔

”اچھا؟“ واقعی؟“

جب بار بار انہوں نے یہ کلمہ کہا تو میں نے بال آخر کہا ”مگر خیرل بھائی، آپ کی حیرانی مجھے حیران کر رہی ہے۔ آپ تو اس شہر میں

رہتے ہیں۔ آپ کو احساس نہیں ہوا کہ تب سے اب تک یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔“

خیرل بھائی بولے ”میاں جب تک ہم میرٹھ کالج میں رہے تب تک تو روزانہ بزاروں سے گزرتے تھے ہمیں تو کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔“

”خیرال بھائی، یہ تو آپ شروع کے سالوں کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ نے اس کالج کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ جب میں نے وہاں ناقھا تو مجھے تعجب ہوا کہ اچھی بھلی پیچھاری پا آپ نے کیوں لات مار دی۔“

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے ”میاں جو اذیات یہ ہے کہ جب ہم میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے تب یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر پیچھار بننے کے بعد عجب سا احساس ہونے لگا کہ ارے یہاں تو ہندو بہت ہیں۔ بس ہم اکھڑ گئے۔“

”مگر اس کے بعد علی گڑھ میں تو آپ کا دل لگنا چاہئے تھا۔“

”ہاں چاہئے تو میں تھا۔“ خیرل بھائی سوچتے ہوئے بولے ”ویسے علی گڑھ میں بھی تو آخر ہم پڑھے ہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ ان دونوں بالکل پتے نہیں چلا۔ اب ہم وہاں گئے تو احساس ہوا کہ یہاں تو مسلمان بہت ہیں۔ جدھن نظر اٹھاؤ اور مسلمان۔ میاں جو اذیق جاننا، ہمیں خفغان ہونے لگا۔ بس ہم وہاں سے اکھڑ لئے۔“

”اور پھر میرٹھ میں آ کر بیٹھ گئے۔“ میرے منہ سے یونہی نکل گیا۔

”ہاں میرٹھ میں اپنے ٹھنے پر۔ مگر اب تم کہہ رہے ہو کہ میرٹھ بدل گیا ہے۔ تو پھر تو اچھا ہی ہوا کہ اپنے ٹھنے پر بیٹھ کر پھر ہم گھر سے نکلے ہی نہیں۔“ یہ کہتے کہتے انہوں نے رحیم الدین بابا کو آتے دیکھا ”اے اور حیم الدین بابا کو تمہارے آنے کا پتہ چل گیا۔ کس پھرتی سے چائے بننا کر لائے ہیں۔“

رحیم الدین بابا کو میں نے مشکل سے پہچانا۔ پہلے بھی کوئے جوان تھے۔ اب تو بالکل ہی کر جھک گئی تھی۔ ”رحیم الدین بابا اچھتو ہو۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“

چائے رکھ کر جانے لگے تو خیرل بھائی نے انہیں نوکا ”رحیم الدین بابا“ تم نے شاید انہیں پہچانا نہیں۔ یہ جواد میاں ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔“

رحیم الدین ٹھنچکے۔ مجھے غور سے دیکھا۔ خوش ہوئے دعا میں دیں۔ واپس جانے لگے۔ پھر پلے قریب آ کر بولے۔ ”میاں“

میرا کر موبھی پاکستان میں ہے۔ کبھی وہ بھی ملا تھیں۔“

”نہیں۔ کس شہر میں ہے وہ۔“

”ارے اس سمجھت نے کبھی خط لکھا ہوتا تو مجھے پڑھتا کہ کس شہر میں ہے۔ بس وہیں کہیں پاکستان میں ہے۔ میاں میرے بڑھاپے پڑھ کر کے ذریعوں اسے ڈھونڈ دیو۔ مل جاوے تو چار جو تے میری طرف سے مار دیا اور کہیو کہ ارے بد بخت ایک دفعہ تو بوڑھے باپ کو صورت دکھایا۔ اور نہیں تو خیریت کی چھٹی ہی لکھ دے۔“

”اچھا بابا“ مل گیا تو کہوں گا۔“

جب وہ چلا گیا تو خیرل بھائی ہنسے اور کہنے لگے ”رجیم الدین بابا مجھ سے کہتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں ایک اشتہار نکلوادو کہ کر موجود ہو کہ اس کا باپ پریشان ہے اور اسکی خیریت کا طالب ہے۔ میں نے کہا کہ رجیم الدین بابا، اگر یہ اشتہار نکلوایا تو پھر تو اس مضمون کے اور بھی بہت سے اہمبار نکلانے پڑیں گے۔ اس پر کہنے لگا کہ وزیر اعلواد تو میں ہی پاکستان کا ایک پھیرا لگائیاں ہوں۔ بیٹھے کی صورت بھی دیکھ لوں گا اور پاکستان کو بھی دیکھ لوں گا۔“ رکے۔ پھر کہنے لگے ”عجیب بات ہے۔ یہاں جو بھی ہے ایک دفعہ ضرور اس کے دماغ میں یہ کیز ابلجا تا ہے کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔“

”مگر خیرل بھائی۔“ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھ دیا ”آپ کا بھی جی نہیں چاہا کہ پاکستان کا ایک پھیرا لگایا جائے۔“ ”میرا؟“ انہوں نے مجھے گھور کے دیکھا ”نہیں۔“

”آخڑ خیرل بھائی، آپ پاکستان سے بے تعلق تو نہیں تھے۔ تحریک میں تو آپ بہت پیش پیش تھے۔“

خیرل بھائی چپ رہے۔ پھر بولے ”ہاں ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت وہ کوئی ملک نہیں تھا، ایک خواب تھا۔“ پھر آہستہ سے بولے ”خواب جب تک خواب رہے اس میں بہت سر ہوتا ہے..... مگر“ یعنی اسی وقت ان کی بُلی جسے انہوں نے میری خاطر رخصت کر دیا تھا آن کو دی۔ خیرل بھائی نے اسے پکارا۔ پھر وہ اسے پکارنے میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ادھوری بات کو پورا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

خیرل بھائی سے ملاقات تنتہ رہی۔ پھر بھی اس نے مجھ پر عجب اثر کیا۔ اندر جو ایک مذبذب تھا وہ رفع ہو چکا تھا۔ جب میں واپس پھرا ہوں تو لتنا مطمئن تھا۔ اور اندر سے کتنا خوش۔ رات دیر سے پہنچا تھا۔ بڑی بھائی سے مذہبیں نہیں ہوئی۔ مگر اب میں اس مذہبیں کے لئے ذہنی طور پر تیار تھا۔ صحیح کتنا خوش خوش میں ناشتہ کی میز پر جا کر بیٹھا تھا۔ مگر مجھے جلدی ہی محسوس ہوا کہ میمونہ چپ چپ

1

ہے۔ میں نے قیاس کیا کہ میرے بیچھے کوئی بات ہوئی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اڑتی سی نظر اس پر ڈالی۔ ایک دو دفعہ بات کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ بیکل ہے، جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

”میونہ کیا بات ہے۔ آج تم چپ چپ ہو۔“

۳۳

"پھر بے چین کیوں ہو؟" اب میں کس اعتماد سے بول رہا تھا۔ "میرا خیال ہے، تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔"

رک کر بولی ”باں۔ کہنا غمیں یوچنا ہے۔“

۳۹

”بس اتنا پوچھتا تھا۔“ اور اچانک اس کے لہجے میں تیزی آگئی۔ ”تم چاکب رہے ہو۔“

میں پہنچا گیا۔ کتنا غیر متوقع سوال تھا۔ میں کیا توقع کر رہا تھا اور اس نے پوچھا کیا۔ ”تمہیں میرا بھائی رہنا شاید.....۔“ اس پہلے کہ میرا فتحہ مکمل ہوا اس نے آوازوی ”بڑی بھائی! ناشتہ شستہ اہو رہا ہے۔ اب آ جائیے نا۔“

"آ رہی ہوں۔" بڑی بھائی کی آواز برآمدے سے آئی۔ اور ساتھ ہی ان کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فقرہ جہاں تو تھا

وہیں میں نے چھوڑ دیا۔ مگر میں بڑی بھائی کے آنے سے میلے کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔

"جلدی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

بڑی بھائی نے میری بات سن لی تھی۔ ”اے ہے، کس بات کی جلدی سے۔ ہمیں بھی تو یہ ہلے۔“ پھر انہیوں نے مجھس نظر وہ

سے میلے مجھے اور پھر میونہ کو دیکھا۔ پھر جب سی ہو گئیں۔ خاموشی سے ناشتہ کہا اور انھوں کھڑی ہوئی۔ ”سکول کو دریہ ہو رہی ہے۔“

"دری د رکھاں سے ہو گئی۔" دری بھائی بو لیں۔

"ہمارا آرجن جلدی پہنچنا سے۔" اور سہ جاؤ دھا۔

بس اسی آن چھوٹے مہاں بھی آن وار ہوئے۔ مگر اس عرصے میں، میں نے سوچ لایا تھا کہ مجھے کہا کہنا سے اور کہا کرنا سے۔

”سـ جـ عـ اـ كـ لـ كـ اـ تـ حـ مـ اـ زـ اـ نـ اـ كـ اـ بـ اـ كـ بـ حـ كـ اـ لـ كـ اـ فـ اـ“

”اللهم اقض عذاب حملاً وصحيحاً وسخياً كلامي وحاجة“

”الله يعلم“، ثم ألقى على الأرض رأسه، ثم قال: ”لهم إني أنت علام“.